# اسلامیات کا یہودی پروفیسر

تحریر: پروفیسر احمد الدین مارہروی

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ برصغیر میں علی گڑھ سے قبل کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے ہاں اسلامیات کی تعلیم شروع کرنے کا اہتمام کیا اور گورنمنٹ نے اس کے معلّم کی تنخواہ پانچ ہزار ماہانہ مقرر کی جبکہ بالعموم اس عہدہ کا مشاہرہ ہزار ڈیڑھ ہزار ہوا کرتا تھا۔

۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کا ایک وفد جو ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مولوی بشیر الدین ایل ایل ڈی بانی اسلامیہ کالج اٹاوہ، مولوی طفیل احمد ایڈیٹر رسالہ ''سودمند'' اور مصنف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' اور راقم الحروف پر مشتمل تھا، جب کلکتہ پہنچا تو ہم نے عمائدین شہر سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ انہی میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، حسین شہید سہروردی وزیر اعظم پاکستان کے چچا، سر حسان سہروردی بھی تھے۔ اس وقت تک اس معلم کا انتخاب عمل میں آچکا تھا اور اسلامیات کی تعلیم شروع ہوئے تقریباً ایک سال گزر گیا تھا۔ میں نے جب سر حسان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس پروفیسر سے، جس کا نام مجھے ڈاکٹر زکریا معلوم تھا، متعارف کرا دیں تو سب سے پہلے تو انہوں نے مجھے اس نام پر ٹوکا اور فرمایا کہ وہ ڈاکٹر زکریا نہیں بلکہ زکرایا ہے اور نسلاً و مذہباً ایک یہودی ہے۔

اس اطلاع سے جیسی سراسیمگی میرے اوپر طاری ہوئی اس کا اندازہ موجودہ دَور کی ذہنیت کے لوگ بمشکل ہی کر سکیں گے۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ فرمایا آپ تو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر اور لیکچرر رہ چکے ہیں اور بخوبی واقف ہیں کہ اس پایہ کے عالم کا تقرر کس طرح عمل میں آتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ فرانس، برطانیہ، جرمنی، مصر اور دوسرے ممالک میں اس آسامی کو

مشتہر کر کے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں' پھر اس مضمون کے تین جید علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس کے فیصلہ پر تقرر عمل میں آتا ہے۔ اس معاملہ میں یونیورسٹی کی عاملہ نے سید سلیمان ندوی' مولانا ابوبکر صدر شعبہ عربی علی گڑھ اور علامہ سعد اللہ پرنسپل عریبک کالج کو نامزد کیا اور ان تینوں کی متفقہ رائے یہی تھی کہ تمام اُمیدواروں میں کوئی بھی علوم اسلامیہ میں اس سے بڑھ کر ماہر نظر نہیں آیا۔ مجھے خود اِس تقرر پر سخت صدمہ اور ندامت ہے' لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس سے ضرور ملیں' اسے پرکھیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

چنانچہ میں انہی کی وساطت سے اس یہودی عالم تک پہنچا اور دو طویل نشستوں میں اس کی ذات' خیالات اور تبحر علمی کے جو نقوش ذہن پر مرتسم ہوئے وہ آج تک قائم ہیں۔ بلند قامت' سرخ و سفید رنگت' فرنچ کٹ داڑھی' چھوٹے چھوٹے قدرے گھنگریالے بال' ستواں ناک جس پر سنہری فریم کا نازک سا چشمہ' ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ جس پر عربی وضع کا چغہ' یہ تھی اس کی پہلی تصویر جو میری نظر میں کھب کر رہ گئی۔

ہم دونوں کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس نے تعظیماً کھڑے ہو کر خالص عربی لہجہ میں السلام علیکم کہا اور انہی کی طرح مصافحہ کیا۔ میرا تعارف ہونے پر بے ساختہ اس کی زبان سے مرحبا نکلا' جسے اس نے دو مرتبہ دہرایا اور پھر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی مؤدب بیٹھ گیا۔ ہمارے وفد کی آمد کی اطلاع اسے اخبارات کے ذریعہ ہو چکی تھی۔ گفتگو کا آغاز اسلامیہ کالج سے ہوا۔ میں نے جب نادار طلبہ کے واسطے ایک دارالاقامہ قائم کرنے کا ذکر کیا تو بے حد متاثر ہوا اور کہنے لگا ہماری قوم کو بھی اس کی سخت ضرورت ہے' لیکن یہ سعادت مسلمانوں ہی کو نصیب ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے غریب بھائیوں کی مدد قومی نہیں' مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتے رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہمارے علم میں تو یہی تھا کہ یہودی دنیا کی سب سے مالدار قوم ہے' تو ہنس کر کہنے لگا کہ اس قسم کے بہت سے افسانے آپ نے پڑھے اور سنے ہوں گے' لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں اگر ایک نہیں ہزاروں قارون بھی ہوتے

تو اس سے بنی اسرائیل کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ ہمارے ہاں غریب اور امیر کا فرق دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ متوسطین کی تعداد بہت ہی کم ہے' حالانکہ معاشرتی اعتبار سے یہی طبقہ ریڑھ کی ہڈی کہلاتا ہے۔ چند کروڑ پتی دولت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اوران کا دماغ ''زِد فـزد '' کے چکر میں الجھا ہوا ہے۔ انہیں قوم کے محتاجوں کی بنیادی ضروریات تک کو سمجھنے کی فرصت نہیں ۔ پھر ہنس کر کہنے لگا کہ اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو ہم میں کارل مارکس (بانی اشتراکیت) پیدا نہ ہوتا۔

گفتگو جب اس نہج پر چل پڑی تو اس کا رُخ خود بخود خاندانی حالات کی طرف مڑ گیا۔ کہنے لگا ہماری قوم عرصہ دراز سے جرمنی میں آباد ہے' لیکن یہودیوں کو وہاں دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے اور ہمارے خلاف نفرت کے جذبات کچھ زیادہ ہی زوردار ہیں۔ اسکولوں میں طلبہ کا داخلہ دشوار ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر تو کسی قسم کی قیود عائد نہیں لیکن عملاً کئی طرح کی رکاوٹیں کھڑی کردی جاتی ہیں۔ البتہ ایک بات دیکھنے میں آئی ہے کہ جو خوش قسمت طالبِ علم ان مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کر لیتے ہیں وہ جرمن طلبہ کے مقابلے میں زیادہ محنتی اور ذہین ثابت ہوتے اور امتحانات میں نمایاں کارکردگی حاصل کرتے ہیں۔

میرے والد موم بتیوں کے تاجر تھے' ہم چار بہن بھائی تھے' گزران متوسط طور پر ہوتی تھی' لیکن والد کی دلی خواہش تھی کہ دونوں بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پیسہ پیدا کریں اور ساتھ ہی قومی خدمات انجام دیں۔ اسکول زندگی میں مجھے ہمیشہ انعامات ملتے رہے لیکن جب میونخ میں داخلہ کا وقت آیا تو یونیورسٹی کا ہر دروازہ بند پایا۔ ابا جان نے والدہ کو اس پر راضی کر لیا کہ تنگی ترشی سے گزر کریں گے مگر زکرایا کو حصولِ تعلیم کی غرض سے بیروت بھیج دیں گے۔ چنانچہ یہی مقام ہے جہاں سے میری موجودہ زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں میرے ہم جماعت' ہم صحبت' ہم مشرب بجائے عیسائیوں کے مسلمان تھے۔ ہمارے مقابلے میں اخلاقی حالت ان کی بھی گری ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی عیسائی طلبہ کی تھی' وہ تو انسانیت ہی سے گئے گزرے تھے' کوئی ظاہری اور باطنی

عیب ایسا نہ تھا جو اُن میں سرایت نہ کر چکا ہو۔ برخلاف اس کے ہمارا اور اہل اسلام کا کھانا پینا بھی ایک تھا اور عقائد کے لحاظ سے بھی ہم میں ایک گونہ ہم آہنگی تھی۔ ان میں سے بعض قرآن پڑھتے تھے جس کو میں سمجھتا نہ تھا لیکن اس کا لہجہ اور ترنم کانوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔

چند روز کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ معلوم تو کروں کہ ان کی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ عربی کی کچھ شد بد ہو چلی تھی مگر بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں' ایک پروفیسر قریب ہی رہتے تھے ان سے جا کر پوچھ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ اس میں وہی کچھ لکھا ہے جو ہمارے صحیفہ مقدس میں موجود ہے' بلکہ بعض امور میں قرآن زیادہ واضح اور بہتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک وقت دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ تورات کے مقابلے میں یہ کتاب فضولیات سے مبرّا ہے۔ اسی زمانہ میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی مبلغ خواجہ کمال الدین اسلام پر لیکچر دینے یونیورسٹی آرہے ہیں۔ علاوہ مسلمانوں کے میں صرف تنہا غیر مسلم تھا جو اُن کا لیکچر سننے وہاں پہنچا' کیونکہ عیسائی ان سے بہت خائف تھے اور چرچ کی طرف سے ممانعت کر دی گئی تھی کہ اس جلسہ میں کوئی شریک نہ ہو۔ جو باتیں اس مبلغ نے بتائیں وہ اتنی واضح تھیں کہ ان سے انکار ناممکن تھا اور سب کا خلاصہ یہ تھا کہ حقانیت اگر دنیا میں کہیں موجود ہے تو اس کا حامل صرف قرآن ہے۔ اس کے بعد میں نے گہری نظر سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور جہاں کوئی بات تشریح طلب نظر آئی تو تفاسیر پر نظر ڈالی۔ مفسرین نے اکثر جگہ احادیث کا حوالہ دیا تھا' ان کو دیکھا مگر وہاں بدقسمتی سے ایسے تضاد نظر آئے کہ مجھے ان میں سے بعض کی اصلیت پر شبہ ہونے لگا۔ بہر حال مطالعہ جاری رہا۔ دو ایک مضامین بھی لکھے جن سے ناموری بھی ہوئی اور کچھ پیسہ بھی ہاتھ آنے لگا۔ اب میں نے عربی کو بطورِ زبان سیکھنا شروع کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد ہی میرے اوپر قرآن کے جوہر کھلے۔ آج کل کا مسلمان تو اسے پڑھتا ہی نہیں' اور پڑھتا ہے تو سمجھتا نہیں اور سمجھ بھی لیتا ہے تو اس پر عمل نہیں کرتا' مگر میری اپنی رائے ہے کہ اگر دنیا اسلامی فلسفہ کو

اپنا لے تو ہر قسم کے معاشی اور اقتصادی مصائب دور ہو سکتے ہیں۔

یہ تمام گفتگو وہ یہودی اس جوش و خروش سے کر رہا تھا کہ اس میں خلوص اور عقیدت کی جھلک صاف نظر آتی تھی اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اس کے باوجود اس نے اسلام کا دامن اب تک کیوں نہیں تھاما۔ لیکن یہ وقت اس سوال کا نہ تھا' اس لئے ہم نے اسے کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھا اور بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس دوران والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے کام بند کر کے ملازمت اختیار کر لی۔ بھائی بھی کسی دھندے میں لگ گیا۔ میں اب آزاد تھا' کچھ عرصہ کے واسطے مصر چلا گیا۔ مکّہ و مدینہ جانے کی اجازت نہ ملی' اس لئے ان کی زیارت کا اشتیاق دل میں لئے دِمشق اور بغداد گیا اور وہاں کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی۔ رفتہ رفتہ اسلامی فقہ پر غور کرنے کا موقع ملا تو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی' کیونکہ یہودیوں اور مسلمانوں کا اختلاف یہیں آ کر کھلتا ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف پُر از معلومات بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ میں نے اس پر مختلف مضامین لکھے اور بالآخر اسی فن پر جرمن زبان میں ایک مقالہ تحریر کیا جسے برلن یونیورسٹی نے اپنے معیار پر پرکھا اور مجھے زبانی امتحان کے واسطے طلب کیا۔ انہوں نے مجھ سے جو سوالات کئے ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے کسی چابک دست اور آزمودہ کار غواص کی ضرورت تھی' لیکن میں نے ان متعصب عیسائیوں کو ایسے دندان شکن جواب دیئے کہ انہیں مزید سوالات کی جرأت نہ ہوئی اور مجھے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ترین ڈگری دینی پڑی۔ مگر ملازمت کے واسطے مجھے پھر غیروں کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ یہاں آئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرے طالب علم تو ہر طرح مطمئن ہیں لیکن بعض متعصب مذہبی حلقوں سے میرے خلاف کچھ نہ کچھ زہر افشانی ہوتی رہتی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ بعض مذہبی مسائل پر اس یہودی عالم کے خیالات معلوم کروں لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس کی نظر بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی ہے تو وعدۂ فردا لے کر اٹھ آنے میں ہی مفر نظر آیا۔ اس نے بھی معذرت کی کہ کلاس لینے کا وقت آ گیا

ہے۔آئندہ کسی شام کوگھر آنے کی تکلیف گوارا کریں اور چائے کی پیالی پر بات چیت ہوتو زیادہ لطف آئے گا۔

## (۲)

جوانی کا جوش تھا کون زیادہ انتظار کرتا۔اگلے دن پانچ بجے شام کوکوٹھی پر جا پہنچا۔سادہ سا مکان‘ معمولی سا فرنیچر‘لیکن ڈرائنگ روم ایرانی قالینوں‘ گاؤ تکیوں اور جھاڑ فانوس سے آراستہ اعلیٰ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھا۔پروفیسر سفید قمیص اور خاکی نیکر پہنے کوئی عربی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ہاتھ میں فنجان تھا جس کی چسکیاں بھی لے رہا تھا۔ملازم کوئی تھا نہیں جو میرے آنے کی اطلاع کرتا‘ نہ دروازے پر پردہ تھا کہ حجاب ہوتا‘ بے تکلف اندر پہنچ گیا۔تذبذب ہوا کہ سلام کس طرح کیا جائے۔آخر یہی مناسب سمجھا کہ اسلامی طریقے پر السلام علیکم کہہ کر مخاطب کروں۔اس پر کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ میری آواز سن کر چونک پڑا اور مرحبا‘ مرحبا کی رٹ لگا دی۔مجھے بٹھا کر اندر گیا اور ایک تھالی میں چائے دانی اور فنجان لے کر آ گیا۔گفتگو شروع ہوئی تو کہنے لگا کہ میں نے ہندوستان آ کر دیکھا ہے کہ مسلمان طلبہ میں مذہبی معلومات کی بے انتہا تشنگی ہے‘ لیکن یہاں کے علماء اس کو بجھانے میں ناکام ہیں۔کچھ یہی کیفیت آپ کی بھی معلوم ہوتی ہے۔

میں نے کہا میرا زاویۂ نظر قدرے مختلف ہے‘میں تو اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے علم میں جو تضاد ہے اس کی وجوہات معلوم کروں۔مثلاً آپ نے قرآن میں پڑھا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام سے بڑی سختی کے ساتھ کہا ہے کہ اگر سود کا کاروبار بند نہ کرو گے تو خدا اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور آپ کی قوم مسلمہ طور پر سود خوار ہے۔اگر آپ کا اور ہمارا خدا ایک ہے تو وہ دو متضاد احکام کس طرح جاری کر سکتا ہے؟ ایک عام یہودی تو ہمارے خدا‘ رسول اور قرآن کو تسلیم نہیں کرتا مگر آپ تو قرآن کی حقانیت کے قائل ہیں‘ پھر اس گتھی کو کس

طرح سلجھائیں گے؟

کوئی اور عالم ہوتا تو میرے اس اعتراض پر ناراض نہیں تو جز بز ضرور ہوتا' مگر کیا مجال جو اُس کی پیشانی پر شکن تک آئی ہو۔ مسکرا کر کہنے لگا آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں سود حلال ہے۔تو معاف کیجئے گا خود آپ کی قوم میں کتنے مالدار ہیں جو سود در سود نہیں لیتے اور اس پر غضب یہ کہ اپنے خدا کو دھوکہ دینے کے واسطے اس کا نام بدل کر منافع رکھ چھوڑا ہے' کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں نے سود کو ناجائز قرار دیا ہے اور منافع کو حلال گردانا ہے۔آپ کا قرآن ہی کہتا ہے کہ جب یہودیوں نے سبت کے معاملہ میں اس قسم کی دھوکہ بازی سے کام لیا تو اس گروہ کو بندر بنا دیا گیا۔اب آپ ہی بتائیے کہ کیا آپ کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو شیشے کے گھر میں بیٹھ کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا اور دوسروں پر خشت باری کرتا ہے! میں نے جب یہاں آ کر چھان بین کی تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ آپ کے نام نہاد علماء تک اپنی دولت میں اضافہ کے واسطے نہ صرف سود لیتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ قوم میں نکو نہ بن جائیں' اس خود ساختہ منافع کو جائز اور حلال قرار دینے کے واسطے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارا جو وفد کلکتہ آیا ہوا تھا اس میں مولوی عقیل احمد صاحب بھی شامل تھے جنہوں نے سود کے جواز میں ایک رسالہ ''سود مند'' جاری کر رکھا تھا' جو مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرتا تھا کہ اپنی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے سود یا منافع کی ایک ایک کوڑی تک وصول کریں۔میری خوش قسمتی تھی کہ اسے اس کا علم نہ تھا ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑ جاتیں۔

اپنی بات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے وہ یہودی اپنے بحر فطانت سے دور کی کوڑی لایا۔ ہماری بے راہ روی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہنے لگا کہ آپ لوگوں کے پاس ایک جیتی جاگتی زندہ کتاب موجود ہے' لیکن جب آپ صرف تیرہ سو برس میں اس مخالف سمت میں چلنے لگے جس کی نشان دہی آپ ہی کے بقول قرآن یہودیوں کے بارے میں کر رہا ہے تو ہم نے جو ہزارہا سال کی خود فراموشی اور ربّیوں (علمائے یہود)

کی کجروی اور گمراہی کے باعث جو روش اختیار کی اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ اگر آپ اُس اسلام کو دیکھیں جس کی قرآن تعلیم دیتا ہے اور پھر اپنی قوم پر گہری نہیں، اچٹتی ہوئی نظر ڈالیں تو آپ بھی میری طرح اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ محمد ﷺ کے زمانے میں یہودیوں کی اخلاقی حالت اتنی گری ہوئی نہیں تھی جتنی، معاف کیجئے، آج آپ کی ہے۔ میں ایک معمولی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن میں ایک سورۃ الحجرات ہے جس میں بعض معاشرتی خرابیوں کو نمایاں کر کے ان کے متعلق بڑے سخت احکامات صادر فرمائے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کرو۔ اور اس خرابی کو زیادہ نمایاں کرنے کے واسطے کہا گیا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ۔ لیکن میرے پاس جو لوگ آتے ہیں ان میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوتا ہوگا جو کسی کی غیبت نہ کرے اور یہ تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ آپ کے نام نہاد علماء اس صف میں کتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں گیا تو اس خیال سے تھا کہ اس سے کہوں گا کہ جب تم اسلام کی حقانیت کے اس درجہ قائل ہو تو آج تک جامۂ یہودیت کیوں پہنے ہوئے ہو؟ اسے اتار دو اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ، لیکن کچھ عجب اتفاق ہوا کہ اس نے میرے کہے بغیر ہی اس مسئلہ کو چھیڑ دیا۔ کہنے لگا لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ میں کہتا ہوں کیا فائدہ؟ جارج برنارڈ شا میری طرف سے جواب دے چکا ہے کہ جب میں اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں تو دل بے اختیار چاہتا ہے کہ مسلمان ہو جاؤں، لیکن جب خود مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو طبیعت برگشتہ ہو جاتی ہے۔ موسوی اور محمدی شریعتیں ایک ہی خدائے واحد کی وضع کردہ ہیں، جن میں جزوی اختلافات ہوں، مگر اصول دونوں کے یکساں ہیں۔ اگر دونوں اپنی اصل پر قائم رہتے تو جو اختلافات آج نظر آ رہے ہیں اتنے نمایاں نہ ہوتے۔ میں نے اکثر مذاہب بالخصوص عیسائیت کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام اور حقیقی یہودیت میں جتنی مماثلت پائی جاتی ہے وہ دنیا کے کسی دو مذاہب میں نہیں ملتی، لیکن معاف کیجئے گا اس وقت خدا کی ترازو میں ہم

دونوں ہم پلہ ہیں اور دونوں ہی اصل سے بہت دور جا پڑے ہیں' اس لئے میرے نزدیک مذہب کی تبدیلی کے معنی ہوں گے کہ کیچڑ سے نکل کر دلدل میں پھنس جاؤں۔

اُس وقت تو یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں کھٹکا تھا لیکن بعد میں جب غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس کی یہودی ذہنیت اپنے مذہب کے مقابلے میں' خواہ وہ کتنا ہی کثیف ہو' اسلام کو حقیر اور کم درجہ سمجھتی ہے۔ کیچڑ سے انسان نکل سکتا ہے لیکن دلدل میں پھنس کر کہیں کا نہیں رہتا اور بالآخر غرق ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس نے بڑی تفصیل سے وہ امور گنوانے شروع کئے جو دونوں مذاہب میں مشترک ہیں' مثلاً بڑے فخریہ طور پر بتایا کہ ذبیحہ اور ختنہ صرف ہمارے ہی مذاہب میں آج تک رائج ہیں۔ آسمانی کتب کے تصور اور تقدیس کا بھی یہی حال ہے' لیکن ہماری قوم بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو کسی دوسری کو حاصل نہیں' مثلاً حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کے زمانے سے جن کے فرزند حضرت یعقوب یا اسرائیل (علیہ السلام) تھے جس سے ہم اپنے کو منسوب کرتے ہیں' یہ نسل خدا تعالیٰ کی منظورِ نظر رہی۔ اس میں بگاڑ بھی پیدا ہوئے' بغاوتیں بھی ہوئیں' دشمنوں نے ہمارے مقدس مقامات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہم نے مصر اور بابل میں غلامی کا بدترین دَور بھی دیکھا' لیکن ہر بار بارگاہِ ایزدی سے ہم کو مدد دی گئی اور رہنے کے واسطے ایسا سرسبز و شاداب وطن عطا ہوا جس کی قرآن تک تعریف کرتا ہے۔ ہدایت کے واسطے پے در پے صاحب معجز[illegible] پیغمبر مبعوث ہوئے۔ کتابیں اور صحیفے بھی نازل ہوتے رہے۔ گمشدہ تورات دوبارہ عطا کی گئی اور ہمارے پیغمبر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی بنائی ہوئی مسجد کو وہ عظمت عطا ہوئی کہ اہل اسلام بھی ابتداءً اسے اپنا قبلہ تسلیم کرتے رہے۔ اس کے مقا[illegible]سلام کے عرب کو دیکھئے تو بنجر ملک میں ایک بُت خانہ بنا ہوا تھا اور پیغمبروں کی [illegible]ھئے تو صرف دو۔

میں حضور پرنور ﷺ کی تعریف میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ میرے مافی الضمیر کو سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ میں حضور ﷺ کی عظمت کا دل و جان سے قائل ہوں اور اس حد

تک معتقد ہوں کہ اگر آپ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوتے تو میں آج بجائے ڈاکٹر زکرایا کے محمد احمد ہوتا۔ آپ کے یہ دونوں نام معنویت کے لحاظ سے مجھے بے حد پسند ہیں اور صرف یہی نہیں میں آپ کو اسم با مسمّیٰ سمجھتا ہوں۔ آپ میں وہ تمام صفات یکجا تھیں جن کے مجتمع ہونے سے ایک انسان کامل فرشتہ بن جاتا ہے۔ آپ ان کی مدح میں شعر گاتے ہیں' ان کے اتباع میں داڑھیاں رکھتے اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہیں' لیکن ان کے اخلاق' مروّت' ہمدردی' رواداری اور ایثار جیسی اصلی صفات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ آپ کی عبادتیں اگر مخلصانہ بھی ہوں تو وہ اپنی ذات تک محدود ہیں۔ آپ کے علماء قومی اور اجتماعی زندگی سے علیحدہ ہو کر منبر و محراب کی زینت بنے بیٹھے ہیں اور کھوکھلے وعظ کہتے ہیں۔ رہ گئے عوام تو ان کے ہاں مذہب صرف رسوم کا نام رہ گیا ہے۔ اس پر مجھے علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آیا۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تو باقی نہیں ہے!

خود اس کے علمی خزانے میں بھی اس قسم کا ایک انمول موتی چھپا ہوا تھا۔ الماری میں سے ایک کتاب اٹھا لایا جس کا نام اس کی پشت پر Islam on the Coss-road چھپا تھا۔ ایک جگہ پر نشانی رکھی تھی' وہ صفحہ کھول کر اُس نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا۔

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد
وائے در گر پس امروز بود فردائے

''اگر مسلمانی اسی کا نام ہے جس کا حافظ دعوے دار ہے تو اس آج پر اگر کل ہوئی تو اس پر افسوس ہی کرنا پڑے گا۔''

[illegible] ہی کو احساس ہو رہا تھا کہ اس گفتگو سے بجز تلخی اور ناگواری کے کچھ حاصل نہ [illegible] لئے میں نے اس کا رخ یہودیت سے عیسائیت کی طرف پھیرا۔ اس نے بھی پہلو بدلا اور ایک خوش آئند مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا یہ موضوع بہت دلچسپ ہے' ان غریبوں کا تو سچ پوچھئے کوئی الوہی مذہب ہی نہیں۔ ہم تو خیر عیسیٰ کو پیغمبر ہی تسلیم

نہیں کرتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے آنے سے قوم میں کچھ رخنہ اندازی ہی واقع ہوئی، خود عیسائیوں سے بھی اس سوال کا جواب بن نہیں پڑتا کہ حضرت آدمؑ جو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے وہ تو خدا کے بیٹے نہ بن سکے اور یوسف نجار اور مریم کے صاحبزادے کس طرح فرزندِ خداوند بن گئے؟ کس نے انہیں بیٹا بنایا؟ اس کی سند کہاں ہے؟ پھر اس بیٹے کو ہماری قوم نے سولی پر چڑھا دیا اور مقتدر باپ نے انگلی تک نہ اٹھائی۔ قرآن نے ان کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ تو سمجھ میں آتا ہے اور اس سے اس کی شان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، لیکن عیسائیوں کی منطق تو پادریوں کی عقل سے بھی ماورا ہے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ انجیل جسے قرآن آسمانی صحیفہ تسلیم کرتا ہے، صفحۂ ہستی سے ایسی غائب ہوگئی کہ اس کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ اب جو چار کتابیں ہیں ان کی حیثیت آپ کی صحاحِ ستہ سے کچھ زیادہ نہیں کہ یسوع نے یہ کہا اور یہ کہا۔ جب سوال کیجئے کہ خدا نے کیا کہا تو جواب دیتے ہیں کہ خدا ہی تو ان کے مُنہ سے بول رہا ہے، مگر ہم اس کے مقابلہ میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ وہ بجائے ایک مُنہ کے چار مُنہ سے کیوں بولتا ہے؟ اب ان کا مذہب صرف حدیث مسیحی تک محدود ہے، اور معاف کیجئے گا آج آپ بھی اس معاملہ میں انہی کے پیروکار ہیں، آپ نے قرآن کریم کو چوم چاٹ کر اور برکت کی نشانی بنا کر طاق پر رکھ دیا ہے اور حدیث کو جو ترجیح دی ہے وہ انہی کی تقلید نظر آتی ہے۔ آپ کے علماء کے ہاں قرآن کی حیثیت کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بخاری شریف کو کتنی فضیلت اور اہمیت حاصل ہے؟ جس طرح ہمارے رِبّی (علماء) عوام کو تورات کے احکام سے دور رکھنا چاہتے ہیں اسی طرح آپ کے مولوی صاحبان نے بھی آپ کو اصل شاہراہ سے ہٹا کر لوپ لائن کی طرف موڑ دیا ہے اور آپ اسی کو شاخ نبات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے ہاں اس رمز کو سمجھنے والے پہلے شاہ ولی اللہ گزرے جنہوں نے اپنے مدرسہ میں قرآن کی تعلیم شروع کی اور اس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، لیکن بظاہر دونوں کی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہیں، کیونکہ عوام پر مولویوں کی گرفت زیادہ وسیع اور مضبوط نظر آتی ہے۔ ایک بات البتہ یقینی ہے کہ اگر دنیا پر کوئی ایسا وقت

پڑا کہ اسے خدائی مذہب کے زیر سایہ ہی فلاح و بہبود نظر آئی تو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں اور وہ ان کی طرف واپس آ سکتے ہیں' لیکن یہ قوم (عیسائی) تو اپنے ہاتھوں اپنا بیڑا غرق کر چکی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح نے مصلوب ہو کر ان کے تمام گناہ اپنے سر لے لئے ہیں' انہیں خدا پرستی کی طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

اس کے بعد میں نے حدیث کی اہمیت کا ذکر چھیڑا تو اس نے نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا کہ یہ مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کی دوسری مثال صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔ محدثین کی محنت اور کاوش کی داد نہ دینا بہت بڑا بخل ہے' لیکن میں ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ آپ نے اس کو ضرورت سے زیادہ اونچی جگہ دے دی ہے اور لوگ اسے قرآن سے بھی افضل سمجھنے لگے ہیں' حالانکہ اس میں ایسے اختلافات بھی موجود ہیں کہ ایک ہی صحابی سے ایک موضوع پر متضاد حدیثیں مروی ہیں اور آپ اس تضاد کے باوجود انہیں ناقابل استرداد گردانتے ہیں۔ پھر آپ نے محدثین کے درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف فرقوں کی حدیثیں جداگانہ ہیں جن میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ آپ نے قرآن کا دامن چھوڑ کر رسول کی محبت میں خالق و مخلوق کے فرق کو بھلا دیا اور حدیث کو قرآن کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دے دی' حالانکہ حدیث دراصل قرآن کی تفسیر ہے' جبکہ علوم و ہدایت کا سرچشمہ تو بہرحال قرآن ہے۔

دورانِ گفتگو ہم میں سے کسی کو بھی وقت کا احساس باقی نہ رہا تھا' حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو گیا اور کسی دُور کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہونے لگی۔ یہودی عالم نے میری طرف کچھ ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور دریافت کیا کہ کیا آپ نماز پڑھتے ہیں؟ اثبات میں جواب سن کر پہلے تو وہ غسل خانہ میں گیا۔ پانی کا جگ پہلے تو تین مرتبہ اچھی طرح دھویا اور کہنے لگا اب یہ آپ کی شریعت کے مطابق بالکل مطہر ہے' باطمینان وضو فرمائیے' سلیپر پہن کر باہر تشریف لائیے اور فریضۂ مغرب ادا کیجئے۔ باہر نکلا تو قبلہ رخ

جاپانی جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ بولا کئی ماہ ہوئے' اس خیال سے خرید لی تھی کہ آپ میں سے جو لوگ میری ملاقات کو آئیں وہ اس پر صلوٰۃ پڑھیں لیکن آپ پہلے شخص ہیں جو اسے استعمال کرر ہے ہیں۔

میں نماز پڑھتا رہا اور وہ بدستور اپنے رسالہ میں منہمک رہا۔ فارغ ہوا تو کہنے لگا میں نے نماز کے فلسفہ پر بہت غور کیا ہے اور اس پر ایک جرمن رسالے میں مضمون بھی لکھا ہے۔ اس میں اخلاقی' جسمانی اور طبی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے' لیکن اس کا اعلیٰ ترین پہلو وہ دماغی یکسوئی ہے جو انسان کو اپنے خالق سے منسلک کر دیتی ہے۔ ہندو سادھوؤں کا گیان' عیسائی تارکانِ دنیا کی ریاضت اور صوفیائے اسلام کا مراقبہ اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ رہ گئی رسم صلوٰۃ تو اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

وقت بہت ہو گیا تھا' لیکن ابھی اسلامی فقہ پر اس کے خیالات معلوم کرنے باقی تھے جس پر اُس نے بڑی تحقیق کر کے ڈگری حاصل کی تھی۔ میرے سوال پر اس نے کہا کہ میری دانست میں اگر دنیا سے تمام علوم ناپید ہو جائیں اور صرف اسلامی فقہ باقی رہ جائے تو انسانی زندگی کو ہمہ گیر' باقاعدہ اور خوش آئند بنانے کے واسطے صرف یہی نسخہ کافی ہے۔ اس کے بعد اسے کہیں اور جانے اور نئے علوم کے ذخائر تلاش کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ کیا کچھ محنت ان بزرگوں نے کی ہے' کتنی دماغ سوزی اور موشگافی سے کام لیا ہے' زندگی کے کسی شعبہ کو بھی تو نہیں چھوڑا اور ہر چیز کو پانی کر کے رکھ دیا۔ ہمارے ہاں بھی یہودی فقہ ہے لیکن اس میں جانبداری ہے' تصنع ہے' بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس میں ریاکاری کو بھی دخل ہے' لیکن آپ کے ہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ رہ گئے عیسائی تو ان کے ہاں فقہ جیسی کوئی شے شروع سے ہے ہی نہیں اور جو ہے بھی تو وہ عوام کے لئے ناقابل قبول ہے۔

میں نے ائمہ فقہ کے باہمی اختلافات کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ انسانی دماغ کی صلاحیتیں اتھاہ ہیں اور ان میں اتنا تنوع ہے کہ دو حقیقی بھائی ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے اور ایک ہی بیج کی پیدائش ہوتے ہیں بالعموم ہم خیال نہیں ہوتے۔ ان سب نے

اپنی صوابدید کے مطابق قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام مسائل کا تجزیہ کیا۔فرق یہ ہے کہ کسی نے اتقاء کومقدم رکھ کر کچھ سختی سے کام لیا اور کسی نے ''لا اکراہ فی الدین'' تحت مذہب کو سہل الحصول بنانے کے واسطے کچھ نرمی برتی۔ میرا رجحان امام شافعی کی طرف ہے' لیکن بعض معاملات میں امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد ابو یوسف کے فتاویٰ زیادہ قابل قبول نظر آتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فن ایک زمانہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ وقت کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں' اجتہاد کی جگہ جگہ ضرورت پڑتی ہے' لیکن اب کوئی ویسا جید عالم سامنے نہیں آتا جو اِن کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے' پہلے خود سیکھے پھر دوسروں کو سکھائے۔

آخر میں کہنے لگا معاف کیجئے' میں نے آپ کی کافی سمع خراشی کی' بعض تلخ اور ناگوار باتیں بھی کیں' صرف اس واسطے کہ آپ جویائے علم بن کر میرے پاس تشریف لائے۔ اس طرح کا جب کوئی تشنہ علم میرے پاس آتا ہے تو میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ اس کی تشنگی دور ہو جائے اور دماغی الجھنیں یکسر دور نہ ہو سکیں تو کم از کم ان کو سلجھانے کا طریقہ سمجھ میں آ جائے۔ آپ مجھ سے آئندہ بھی مل سکتے ہیں۔ افسوس کہ پھر اس کا موقع تو ہاتھ نہ آ سکا لیکن اس کے بعد یہ خلجان مجھے ہمیشہ ستاتا رہا کہ یہ یہودی پروفیسر اپنے طلبہ کو کس قسم کی تعلیم دیتا ہوگا اور وہ کس ذہنیت کے مسلمان بن کر یونیورسٹی سے نکلتے ہوں گے۔ 00

---

## بقیہ: حکمت اقبال

ملت کی ترقی اور اسے قائم و دائم رکھنے کے لئے از بس ضروری ہے۔ توحیدِ باری تعالیٰ ہی ملت اسلامیہ کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ہماری بقا اور ترقی کا انحصار لَا و اِلَّا کی حکمت کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں ہے:

نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا
پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ!
وہ ملت روح جس کی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لب ریز اُس ملت کا پیمانہ! (ضربِ کلیم)